خلافت اور ملوکیت کا فرق

ابوالاعلیٰ مودودی

(۳)

بنی عباس | بنی امیہ کی حکومت سندھ سے لیکر اسپین تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں کمال درجہ دبدبے کی حکومت تھی اور بظاہر اس کی طاقت کو دیکھ کر گمان نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کسی کے ہلائے ہل سکے گی، لیکن جس طرز پر وہ چل رہی تھی اس کی وجہ سے بس گردنیں ہی اس کے آگے جھکی ہوئی تھیں، دلوں میں اس کی کوئی جڑ نہ تھی۔ اسی لیے پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ عباسیوں نے نہایت آسانی سے اُن کا تختہ اُلٹ دیا، اور جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان پر رونے والی نہ تھی۔

عباسیوں کے وعدے | نئے مدعیانِ خلافت جس وجہ سے کامیاب ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے عام مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ ہم خاندانِ رسالت کے لوگ ہیں، ہم کتاب و سنّت کے مطابق کام کریں گے اور ہمارے ہاتھوں سے حدود اللہ قائم ہونگی۔ ربیع الثانی ۱۳۲ھ میں جب سفّاح کے ہاتھ پر کوفہ میں خلافت کی بیعت ہوئی تو اس نے اپنی پہلی تقریر میں بنی امیہ کی زیادتیاں بیان کرنے کے بعد کہا:

"میں یہ امید رکھتا ہوں کہ جس خاندان سے تم کو خیر ملی تھی اُس سے ظلم و ستم، اور جہاں سے تم کو صلاح ملی تھی وہاں سے فساد تم نہ پاؤ گے۔"

سفّاح کے بعد اُٹھ کر اس کے چچا داؤد بن علی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ:

"ہم اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ اپنے لیے سیم و زر جمع کریں یا محلات بنوائیں اور ان میں نہریں کھود کر لائیں، بلکہ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے بنی عم (آلِ ابی طالب) پر ظلم کیا جا رہا تھا اور بنی امیہ تمہارے درمیان بُرے طریقوں پر چل رہے تھے۔ انہوں نے تم کو ذلیل و خوار کر رکھا تھا اور تمہارے بیت المال میں بے جا

تصرفات کر رہے تھے۔ اب ہم پر تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسول اور حضرت عباس کا ذمہ ہے کہ ہم تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سیرت کے مطابق حکومت کریں گے۔[61]

لیکن حکومت حاصل ہونے کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ یہ سب کچھ فریب تھا۔

اُن کا عمل بنی امیہ کے دارالسلطنت دمشق کو فتح کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتلِ عام کیا جس میں ۵۰ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۷۰ دن تک جامع بنی امیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی۔ حضرت معاویہؓ سمیت تمام بنی امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت مل گئی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا، چند روز تک اسے منظرِ عام پر لٹکائے رکھا گیا اور پھر جلا کر اس کی راکھ اڑا دی گئی۔ بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور ان کی تڑپتی ہوئی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھایا گیا۔ بصرے میں بنی امیہ کو قتل کر کے اُن کی لاشیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچی گئیں اور انہیں سڑکوں پر ڈال دیا گیا جہاں کتے انہیں بھنبھوڑتے رہے۔ یہی کچھ مکے اور مدینہ میں بھی ان کے ساتھ کیا گیا۔[62]

سفاح کے خلاف موصل میں بغاوت ہوئی تو اس نے اپنے بھائی یحییٰ کو اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ یحییٰ نے اعلان کیا کہ جو شہر کی جامع مسجد میں داخل ہو جائے گا اس کے لیے امان ہے۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے۔ پھر مسجد کے دروازوں پر پہرہ لگا کر ان امان یافتہ پناہ گزینوں کا قتلِ عام کیا گیا اور گیارہ ہزار آدمی مار ڈالے گئے۔ رات کو یحییٰ نے اُن عورتوں کی آہ و بکا کا شور سنا جن کے مرد مارے گئے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ کل عورتوں اور بچوں کی باری ہے۔ اس طرح تین دن موصل میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا جس میں عورت، مرد، بچہ، بوڑھا، کوئی معاف نہ کیا گیا۔ یحییٰ کی فوج میں ۴ ہزار زنگی تھے۔ وہ موصل کی عورتوں پر ٹوٹ پڑے اور زنا بالجبر کا طوفان برپا کر دیا۔ ایک عورت نے یحییٰ کے گھوڑے کی لگام

---

[61] الطبری، ج ۶، ص ۸۲-۸۳۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۲۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۴۱۔

[62] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۳-۳۳۴۔ ۳۴۱۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۴۵

پکڑ کر اسے شرم دلائی کہ "تم بنی ہاشم میں سے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی اولاد ہو تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے زنگی سپاہی عرب مسلمان عورتوں کی آبروریزی کرتے پھر رہے ہیں"۔ یحییٰ کو غیرت آگئی۔ اس نے اپنی فوج کے زنگی سپاہیوں کو تنخواہوں اور انعامات کا لالچ دے کر جمع کیا اور سب کو قتل کرا دیا۔[۶۳]

یزید بن عمر بن ہبیرہ کو سفاح نے اپنے ہاتھوں سے امان نامہ لکھ کر دیا اور پھر عہد و پیمان کی صریح خلاف ورزی کر کے اسے قتل کرا دیا۔[۶۴]

خراسان کے مشہور فقیہ ابراہیم بن میمون الصائغ نے کتاب و سنت کے مطابق حدود اللہ قائم کرنے کے وعدوں پر بھروسہ کر کے عباسی دعوت کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کیا تھا اور انقلاب کی کامیابی تک وہ ابومسلم خراسانی کے دستِ راست بنے رہے تھے۔ مگر کامیابی کے بعد جب انہوں نے ابومسلم سے حدود اللہ کے قیام کا مطالبہ کیا اور کتاب و سنت کے خلاف کام کرنے پر ٹوکا تو ابومسلم نے ان کو سزائے موت دی۔[۶۵]

منصور کے زمانہ میں عباسیوں کے اس دعوے کی قلعی بھی کھل گئی کہ وہ آل ابی طالب پر بنی امیہ کے مظالم کا بدلہ لینے اٹھے تھے۔ جس زمانہ میں محمد بن عبداللہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم روپوش تھے اور منصور ان کی تلاش میں سرگرم تھا، اس نے ان کے پورے خاندان اور ان کے رشتہ داروں کو صرف اس قصور میں گرفتار کر لیا کہ وہ اُن کا پتہ نہیں دے رہے تھے۔ ان کی ساری جائداد ضبط کر کے نیلام کی گئی۔ ان کو بیڑیوں اور طوق و زنجیر میں مقید کر کے مدینے سے عراق لے جایا گیا۔ جیل میں ان پر سخت مظالم کیے گئے۔ محمد بن ابراہیم بن الحسن کو دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ ابراہیم بن عبداللہ کے خسر کو ننگا کر کے ڈیڑھ سو کوڑے لگائے گئے، پھر قتل کر کے ان کا سر خراسان میں گشت کرایا گیا اور چند آدمی اس کے ساتھ عوام

---

[۶۳] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۹-۳۴۰

[۶۴] الطبری، ج ۶، ص ۱۰۷ تا ۱۰۹۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۳۳۸۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۵۴-۵۵

[۶۵] البدایہ، ج ۱۰، ص ۶۸۔

کے سامنے یہ شہادت دیتے پھرے کہ یہ نفسِ زکیہ کا سر ہے[۶۶]۔ کچھ مدت بعد جب نفسِ زکیہ مدینہ میں شہید ہوئے تو ان کا سر کاٹ کر شہر شہر پھرایا گیا، اور ان کی اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں تین دن تک مدینہ میں برسرِ عام لٹکائی گئیں، پھر کوہ سلع کے قریب اُنہیں مقابر یہود میں پھینک دیا گیا[۶۷]۔

اِن واقعات نے ابتدا ہی میں یہ ظاہر کر دیا کہ بنی امیہ کی طرح بنی عباس کی سیاست بھی دین سے آزاد ہے، اور سیاسی اغراض کے لیے خدا کی قائم کی ہوئی حدوں کو پھاند جانے میں جس طرح اُنہیں باک نہ تھا، اِنہیں بھی نہیں ہے۔ اُن کے ہاتھوں جو انقلاب ہوا اس سے صرف حکمراں ہی بدلے، طرزِ حکومت نہ بدلا۔ اُنہوں نے اُموی دَور کی کسی ایک خرابی کو بھی دُور نہ کیا، بلکہ اُن تمام تغیرات کو جُوں کا توں برقرار رکھا جو خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے آجانے سے اسلامی ریاست کے نظام میں رُونما ہوتے تھے۔

بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بنی اُمیہ کے لیے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے تو عباسی خلفاء کے لیے ایران کے کسریٰ۔

شوریٰ کا نظام بھی اُسی طرح معطل رہا اور اس سے وہی نتائج رونما ہوتے رہے جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

بیت المال کے معاملہ میں بھی ان کا طرزِ عمل اُمویوں سے مختلف نہ تھا۔ نہ اُس کی آمدنی کے معاملہ میں شریعت کے احکام و قواعد کی پابندی کی جاتی تھی نہ خرچ کے معاملہ میں۔ بیت المال امت کا نہیں بادشاہ کا خزانہ تھا جس کی آمد و خرچ کے معاملہ میں کسی کو محاسبہ کا حق نہ تھا۔

عدلیہ پر خلیفہ اور اس کے قصر اور امراء اور متوسلین کا دباؤ بھی ویسا ہی رہا جیسا بنی امیہ کے عہد میں تھا۔ خلیفہ المہدی کے زمانہ میں اُس کے ایک قائد اور ایک تاجر کا مقدمہ قاضی عبیداللہ بن حسن کی عدالت میں پیش ہوا۔ خلیفہ نے قاضی صاحب کو لکھ بھیجا کہ اِس مقدمے کا فیصلہ میرے قائد کے حق میں کیا جائے۔

---

۶۶ الطبری، ج ۶، ص ۱۶۱-۱۷۱ تا ۱۸۰۔ ابن الاثیر، ج ۴ ص ۳۷۰ تا ۳۷۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۸۰-۸۲

۶۷ البدایہ، ج ۱۰، ص ۹۰۔

قاضی صاحب نے اِس حکم کی اطاعت نہ کی اور معزول کر دیئے گئے[۶۸]۔ ہارون الرشید کے عہد میں قاضی حفص بن غیاث نے خلیفہ کی بیگم زُبیدہ کے ایک آدمی کے خلاف فیصلہ کیا اور انہیں بھی عہدے سے ہٹنا پڑا[۶۹]۔

شُعُوبی تحریک اور زندقہ | نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں جو بنی امیہ نے بھڑکائی تھیں، بنی عباس کے عہد میں وہ پہلے سے بھی شدید تر ہو گئیں۔ اوّل تو عباسی دعوت کی بنیاد ہی ایک خاندان کے مقابلے میں دوسرے خاندان کے نسلی استحقاق پر تھی۔ مگر اپنی کامیابی کے لیے انہوں نے ایک طرف عرب قبائل کو ایک دوسرے کے خلاف لڑانے، اور دوسری طرف عجمیوں کو عربوں کے خلاف بھڑکا کر استعمال کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ عباسی دعوت کے امام، ابراہیم بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس نے ابومسلم خُراسانی کو خراسان کے کام کا سربراہ مقرر کرتے ہوئے جو ہدایات بھیجی تھیں اُن میں سے ایک یہ تھی کہ عربوں میں یمانی اور مُضری کے جو اختلافات موجود ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر یمنیوں کو مُضریوں سے خوب لڑاؤ، اور دوسری ہدایت یہ تھی کہ اگر ممکن ہو تو ایک زبان بھی عربی بولنے والی باقی نہ چھوڑو اور پانچ بالشت یا اس سے زیادہ کا کوئی عرب لڑکا جس کے متعلق تمہیں ذرا بھی شبہ ہو، اسے قتل کر ڈالو[۷۰]۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ کے دور میں اُن کے عربی تعصب کی وجہ سے عجمی قوم پرستی (شعوبیت) کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، بنی عباس کے زمانے میں وہ پُوری قوت کے ساتھ بھڑک اٹھی، اور اس نے صرف عربی عصبیت ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود اسلام کے خلاف بھی زندقے کا ایک محاذ اٹھا کھڑا کیا۔

اہلِ عجم میں نسلی فخر و غرور کا جذبہ پہلے ہی موجود تھا۔ خصوصاً عربوں کو تو وہ اپنے مقابلے میں نہایت حقیر سمجھتے تھے۔ اسلامی فتوحات کے دور میں جب وہ ریگستانِ عرب کے شتربانوں سے مغلوب ہوئے تو اوّل اوّل انہیں اپنی ذلّت کا سخت احساس ہوا۔ مگر اسلام کے اصولِ انصاف و مساوات، اور صحابہؓ

---

[۶۸] الخطیب، تاریخ بغداد، ج ۱۰، ص ۳۰۹۔ مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۹۳۱

[۶۹] طاش کبری زادہ، مفتاح السعادہ، ج ۲، ص ۱۱۹۔ طبع اوّل، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۲۹ھ

[۷۰] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۲۹۵۔ البدایہ، ج ۱۰، ص ۲۸۔

تابعین اور علما و فقہاء امت کے دیندارانہ طرزِ عمل نے نہ صرف یہ کہ ان کے اِس زخم پر مرہم رکھ دیا، بلکہ انہیں عالمگیر امتِ مسلمہ کے اندر کامل معاشرتی مساوات کے ساتھ جذب کرنا شروع کر دیا۔ اِس کی پشت پر اگر حکومت کی انتظامی پالیسی بھی انہی اصولوں کے مطابق ہوتی تو کبھی کسی غیر عرب قوم کے اندر اپنی علیحدگی کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکتا۔ لیکن پہلے بنی امیہ کی سخت عربی عصبیت نے (جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں)، ان کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کر کے اُن میں جوابی تعصب پیدا کیا، اور پھر عباسیوں نے اسے اپنی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کر کے اسے اُبھرنے اور چھا جانے کا موقع دے دیا۔ اہلِ عجم نے اسی امید پر عباسی دعوت کا ساتھ دیا تھا کہ ہماری تلواروں کے بل پر جب نئی سلطنت قائم ہو گی تو اس پر ہم چھائے رہیں گے اور عربی اقتدار کا خاتمہ کر دیں گے۔ ان کی یہ توقع ٹھیک تھی اور وہ پوری ہوئی۔

الجاحظ کہتا ہے کہ دولتِ عباسیہ ایک خراسانی حکومت بن کر رہ گئی[۱]۔ منصور کے زمانہ خلافت میں سپہ سالاری اور گورنری کے اکثر و بیشتر مناصب پر عجمی مقرر کیے گئے اور عربوں کی بالادستی ختم ہو کر رہ گئی[۲]۔ الجہشیاری نے تاریخ الوزراء میں منصور کے عُمّال کی جو تفصیلات دی ہیں ان میں سب عجمی ہی عجمی نظر آتے ہیں[۳]۔ ان عجمیوں نے سیاسی قوت حاصل کر کے شعوبیت کی تحریک زور و شور سے اٹھائی جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے محض قوم پرستانہ تحریک ہی نہ تھی، بلکہ اپنے جلو میں زندقہ و الحاد اور اباحیت کے جراثیم بھی ساتھ ساتھ لے آئی تھی۔

اِس شعوبی تحریک کا آغاز تو اس بحث سے ہوا تھا کہ عربوں کو عجمیوں پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، لیکن بہت جلدی اس نے عربوں کی مخالفت کا رنگ اختیار کر لیا اور عرب کی مذمت میں، حتیٰ کہ قریش سمیت اُن میں سے ایک ایک قبیلے کی مذمت میں کتابیں لکھی جانے لگیں، جن کا تفصیلی ذکر

---

[۱] البیان والتبیین، ج ۳، ص ۱۸۱، مطبعۃ الفتوح الادبیہ، مصر، ۱۳۳۲ھ۔

[۲] المسعودی، مُروج الذہب، ج ۲، ص ۵۱۵۔ مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۹۵۸ء۔ المقریزی، کتاب السلوک، ج ۱، ص ۱۵۔ دار الکتب المصریہ، ۱۹۳۴ء۔

[۳] مطبوعہ ویانا، ۱۹۲۶ء، صفحات ۱۳۹-۱۵۳-۱۵۵-۱۵۷۔

ابن الندیم کی الفہرست میں ہمیں ملتا ہے۔ معتدل قسم کے شعوبی تو اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ مگر اس گروہ کے انتہا پسند لوگ عربوں سے گزر کر خود اسلام پر حملے کرنے لگے اور عجمی امراء، وزراء، کُتّاب (SECRETARIES) اور فوجی قائدین نے درپردہ اُن کی ہمت افزائی کی۔ الجاحظ کہتا ہے کہ "بہت سے لوگ، جن کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پائے جاتے ہیں، ان کے اندر یہ بیماری شعوبیت کی راہ سے آئی ہے۔ وہ اسلام سے اس لیے بیزار ہیں کہ عرب اس دین کو لائے تھے"[۴] ان لوگوں نے مانی، زردشت اور مَزدک کے مذاہب و عقائد کو زندہ کرنا شروع کیا۔ انہوں نے عجمی تہذیب اور نظامِ سیاست و ملک داری کے فضائل بیان کرنے شروع کیے۔ انہوں نے شعروادب کے پردے میں فسق و فجور اور اخلاقی بے قیدی کی تبلیغ شروع کی۔ دین اور اس کے حدود کا مذاق اڑایا۔ شراب و شاہد کی طرف دعوت دی۔ زُہد و تقویٰ پر پھبتیاں کسیں۔ آخرت اور جنت دوزخ کی باتیں کرنے والوں کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ اور ان میں سے بعض نے جھوٹی حدیثیں گھڑ گھڑ کر پھیلائیں تاکہ مسلمانوں کا دین خراب کریں۔ چنانچہ ایک زندیق ابن ابی العوجاء جب گرفتار کیا گیا تو اس نے اعتراف کیا کہ میں نے چار ہزار ایسی حدیثیں گھڑی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا ہے، اور احکامِ اسلامی میں ردّو بدل کر ڈالا ہے۔ منصور کے زمانہ میں کوفے کے گورنر محمد بن سلیمان بن علی نے اس کو موت کی سزا دی[۵]۔ ایک اور شخص یونس بن ابی فَرْوَہ نے اسلام اور عرب کی مذمت میں ایک کتاب لکھ کر قیصرِ روم کے دربار میں پیش کی اور اس پر انعام پایا[۶]۔ الجاحظ اپنے رسائل میں عجمی کاتبوں (حکومت کے سکرٹریوں) کی ایک کثیر تعداد کا حال یہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ قرآن کی ترتیب پر طعن کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں تناقض ہے۔ احادیث کو جھٹلاتے ہیں اور ان کی صحت میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔ صحابہ کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی زبان رکتی ہے۔ قاضی شُریح اور حسن بصری اور الشَّعبی کا ذکر آتا ہے

---

[۴] کتاب الحیوان، ج ۷، ص ۶۸۔ المطبعۃ التقدم، مصر، ۱۹۰۶ء

[۵] البدایہ، ج ۱۰، ص ۱۱۳۔

[۶] امالی المرتضیٰ، ج ۱، ص ۹۰ - ۱۰۰۔ المطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۹۰۷ء

تو یہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں۔ مگر اردشیر بابکان اور نوشیروان کا ذکر کرتے ہوئے ان کی سیاست اور ان کے تدبّر کی تعریف میں یہ رطب اللسان ہو جاتے ہیں[۶۶]۔ ابو العلاء المعرّی اس عہد کے بڑے بڑے نامور عجمیوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ سب زندیق تھے، مثلاً دِعبل، بَشّار بن بُرْد، ابو نواس، ابو مسلم خراسانی وغیرہ[۶۷]۔ اور یہ زندقہ صرف اعتقادی گمراہیوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ عملاً اخلاقی حدود سے آزادی اُس کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح تھی۔ ابنِ عبد ربّہٖ کہتا ہے کہ عوام میں یہ بات معلوم و معروف تھی کہ شراب، زنا اور رشوت زندقے کے لوازم اور اس کی کھلی علامات ہیں[۶۹]۔

یہ فتنہ خلیفہ منصور عباسی کے عہد (۱۳۶ھ/۷۵۴ء - ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) میں پوری طرح سر اٹھا چکا تھا۔ اس سے مسلمانوں میں صرف اعتقادی و اخلاقی فساد ہی پھیلنے کا خطرہ نہ تھا بلکہ سیاسی و اجتماعی حیثیت سے یہ مسلم معاشرے اور ریاست کو بھی پارہ پارہ کر دینے والا تھا۔ منصور کا جانشین المہدی اپنے خاندان کی سیاسی پالیسی کے یہ خوفناک نتائج دیکھ کر گھبرا اٹھا اور اس نے نہ صرف طاقت سے اِس تحریک کو مٹانے کی کوشش کی، بلکہ علماء کے ایک گروہ کو اس کام پر بھی مامور کیا کہ زنادقہ سے بحث کریں اور ان کے رد میں کتابیں لکھ کر اُن شکوک کو دماغوں سے نکالیں جو یہ لوگ اسلام کے خلاف عوام میں پھیلا رہے تھے[۷۰]۔ اس کی حکومت میں ایک مستقل محکمہ عمر الکلواذی کے تحت قائم کر دیا گیا جس کا کام یہ تھا کہ زندقہ کا استیصال اور زنادِقہ کی سرکوبی کرے[۷۱]۔ اپنے بیٹے الہادی کو اس نے جو ہدایات دی تھیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندقے کے خطرات کس شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا:

---

[۶۶] ثلاث رسائل للجاحظ، ص ۴۲، المطبعۃ السلفیہ، قاہرہ، ۱۳۴۴ھ۔

[۶۷] الغفران، دار المعارف، مصر، ۱۹۵۰ء

[۶۹] العِقد الفرید، ج ۲، ص ۱۷۹

[۷۰] المسعودی، ج ۲، ص ۴۱۵۔ المقریزی، کتاب السلوک، ج ۱، ص ۱۵۔

[۷۱] الطبری، ج ۶، ص ۳۸۹ - ۳۹۱ - البدایہ، ج ۱۰، ص ۱۴۹

"اگر یہ حکومت میرے بعد تیرے ہاتھ میں آئے تو مانی کے پیروؤں کا استیصال کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا۔ یہ لوگ پہلے تو عوام کو ظاہری بھلائیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، مثلاً فواحش سے اجتناب، دنیا میں زہد اور آخرت کے لیے عمل۔ پھر انہیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ گوشت حرام ہے، پانی کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے (یعنی غسل نہ کرنا چاہیے) اور کسی قسم کے جانور کو ہلاک نہ کرنا چاہیے۔ پھر انہیں دو خداؤں کے اعتقاد کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور آخر کار بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح اور پیشاب سے غسل تک حلال کر دیتے ہیں، اور بچوں کو چراتے ہیں تاکہ انہیں ضلالت پر پرورش کریں"[۵۲]

المہدی کا یہ بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس زمانہ میں عجمی زنادقہ بظاہر مسلمان بن کر بباطن اپنے قدیم مذاہب کی تجدید کے لیے کوشاں تھے۔ المسعودی کے بیان کے مطابق یہ دعوت ان تراجم کی بدولت پھیل رہی تھی جو منصور کے عہد میں پہلوی اور فارسی زبان سے ہوئے تھے، اور ابن ابی العوجاء حماد عجرد، یحییٰ بن زیاد، مطیع بن ایاس جیسے لوگوں کی تصانیف اس زہر کو پھیلا رہی تھیں[۵۳]

خلاصۂ کلام یہ ہے مختصر روداد ان تغیرات کی جو خلافتِ راشدہ کی جگہ ملوکیت کے آجانے سے رونما ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت اور اس کی رائے کو نظر انداز کر کے کسی شخص، خاندان یا گروہ کا اپنے اقتدار کے لیے کوشاں ہونا اور زبردستی اسے قائم کرنا کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس غلطی کی ابتدا کرتے وقت چاہے اسے یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس کا اقدام یہ نتائج پیدا کرے گا، اور اس کی نیت ہرگز یہ نہ ہو کہ یہ نتائج اس سے برآمد ہوں، لیکن بہرحال یہ اس کے فطری نتائج ہیں جو رونما ہو کر رہتے ہیں۔

لیکن یہ خیال کرنا سخت غلط ہوگا کہ ان سیاسی تغیرات نے سرے سے اسلامی نظامِ زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ بعض لوگ بڑے سطحی انداز میں تاریخ کا مطالعہ کر کے بے تکلف یہ فیصلہ کر

---

۵۲ الطبری، ج ۶، ص ۴۳۳-۴۳۴

۵۳ مروج الذہب، ج ۲، ص ۵۱۵۔

ڈالتے ہیں کہ اسلام تو بس تیس سال چلا اور پھر ختم ہو گیا۔ حالانکہ اصل صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ آگے کی چند سطور میں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کو جب اس سیاسی انقلاب سے سابقہ پیش آیا تو اس کے اجتماعی شعور نے کس طرح اپنے نظامِ زندگی کو سنبھالنے کے لیے ایک دوسری صورت اختیار کر لی۔

قیادت کی تقسیم اس سے پہلے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل نیابت تھی۔ خلیفۂ راشد محض راشد (راست رو) ہی نہ ہوتا تھا بلکہ مرشد (راہ نما) بھی ہوتا تھا۔ اُس کا کام محض مملکت کا نظم و نسق چلانا اور فوجیں لڑانا نہ تھا بلکہ اللہ کے پورے دین کو مجموعی طور پر قائم کرنا تھا۔ اُس کی ذات میں ایک ہی مرکزی قیادت تھی جو سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی سربراہی بھی کرتی تھی اور عقیدہ و مذہب، اخلاق و روحانیت، تہذیب و تمدن، تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے تمام معاملات میں اُن کی امامت و رہبری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ جس طرح اسلام ہر پہلو کا جامع ہے اسی طرح یہ قیادت بھی ہر پہلو کی جامع تھی اور مسلمان پورے اعتماد کے ساتھ اپنی اجتماعی زندگی اس کی رہنمائی میں بسر کر رہے تھے۔

اس خلافت کی جگہ جب ملوکیت آئی تو نہ وہ اِس جامع قیادت کی اہل تھی، نہ مسلمان ایک دن کے لیے بھی اُس کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار ہوتے۔ بادشاہوں کے جو کارنامے ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں، ان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کا کوئی اخلاقی وقار قوم میں قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ گردنیں زبردستی جھکا سکتے تھے اور وہ انہوں نے جھکا لیں۔ وہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو خوف و طمع کے ہتھیاروں سے اپنی اغراض کا خادم بھی بنا سکتے تھے اور انہوں نے بنا لیا۔ مگر وہ دل نہیں جیت سکتے تھے کہ لوگ ان کو اپنے دین کا امام بھی مان لیتے۔

یہ نئی صورتِ حال پیدا ہوتے ہی مسلمانوں کی قیادت دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی:

ایک حصّہ سیاسی قیادت کا تھا جسے طاقت سے بادشاہوں نے حاصل کر لیا تھا، اور

چونکہ اسے نہ طاقت کے بغیر ہٹایا جا سکتا تھا، نہ سیاسی قیادت بلا طاقت ممکن ہی تھی، اس لیے امت نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول کر لیا۔ یہ قیادت کافر نہ تھی کہ اسے رد کر دینے کے سوا چارہ نہ ہوتا۔ اس کے چلانے والے مسلمان تھے جو اسلام اور اس کے قانون کو مانتے تھے۔ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ کے حجت ہونے کا انہوں نے کبھی انکار نہ کیا تھا۔ عام معاملات ان کی حکومت میں شریعت ہی کے مطابق انجام پاتے تھے۔ صرف ان کی سیاست دین کی تابع نہ تھی اور اس کی خاطر وہ اسلام کے اصولِ حکمرانی سے ہٹ گئے تھے۔ اس لیے امت نے ان کی سیاسی قیادت اس حد تک قبول کر لی کہ ان کے تحت مملکت کا انتظام چلتا رہے، امن و امان قائم رہے، سرحدوں کی حفاظت ہوتی رہے، اعدائے دین سے جہاد ہوتا رہے، اور عدالتوں کے ذریعہ سے اسلامی قوانین کا اجراء برقرار رہے۔ ان مقاصد کے لیے صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اگر اس قیادت کی بیعت کی تو وہ اس معنی میں نہ تھی کہ وہ انہی بادشاہوں کو امام برحق اور ان کی خلافت کو خلافتِ راشدہ و مرشدہ مانتے تھے، بلکہ وہ صرف اس معنی میں تھی کہ وہ اس امرِ واقعی کو تسلیم کرتے تھے کہ اب امت کی سیاسی قیادت کے مالک یہی لوگ ہیں۔

دوسرا حصہ دینی قیادت کا تھا جسے بقایائے صحابہ، تابعین و تبع تابعین، فقہاء و محدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم کر لی۔ یہ قیادت اگرچہ منظم نہ تھی۔ اگرچہ اس کا کوئی ایک امام نہ تھا جسے سب نے اپنا مرشد مان لیا ہو۔ اگرچہ اس کی کوئی با اختیار کونسل نہ تھی کہ جو دینی مسائل پیدا ہوں ان کے بارے میں بروقت وہ ایک فیصلہ صادر کر دے اور وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے۔ یہ سب لوگ اپنی انفرادی حیثیت میں الگ الگ کام کر رہے تھے، اور ان متفرق افراد کے پاس اخلاقی اثر و وقار کے سوا کوئی طاقت نہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ سب ایک ہی چشمہ ہدایت — کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ — سے فیض یاب تھے، اور نیک نیتی کے ساتھ دینی رہنمائی کر رہے تھے، اس لیے جزئیات میں مختلف الرائے ہونے کے باوجود مجموعی طور پر

ان کا مزاج ایک ہی تھا، اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پراگندہ ہونے کے باوجود ان کا پورا گروہ مسلمانوں کو ایک ہی فکری و اخلاقی قیادت فراہم کر رہا تھا۔

اِن دونوں قسم کی قیادتوں میں تعاون کم اور تصادم یا کم از کم عدم تعاون زیادہ رہا۔ سیاسی قیادت نے دینی قیادت کو اُس کے فرائض انجام دینے میں بہت کم مدد دی، اور جتنی مدد وہ دے سکتی تھی، دینی قیادت نے اس سے بھی کم اسے قبول کیا، کیونکہ اس مدد کے بدلے میں جو قیمت اسے سیاسی قیادت کو ادا کرنی پڑتی اسے ادا کرنے کے لیے اُس کا ایمان و ضمیر تیار نہ تھا۔ پھر خود اُمّت کا حال بھی یہ تھا کہ دینی قیادت کے لوگوں میں سے جو بھی سلاطین کے قریب گیا، اور جس نے بھی کوئی منصب یا وظیفہ اُن سے قبول کر لیا، وہ مشکل ہی سے قوم میں اپنا اعتماد برقرار رکھ سکا۔ سلاطین سے بے نیازی، اور ان کے قہر و غضب کے مقابلے میں ثابت قدمی مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کی اہلیت کا معیار بن گئی تھی۔ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی اللہ کا بندہ چلا تو قوم بڑی کڑی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتی رہی، اور اس کی بزرگی کو اس نے صرف اُس وقت تسلیم کیا جب سلطان کے قریب جا کر بھی اُس نے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت نہ کی۔ عام مسلمان تو درکنار، خود وہ لوگ بھی جو سیاسی قیادت کے ہاتھ بِک چکے تھے، اِس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ دین کا امام و پیشوا کسی ایسے شخص کو مان لیں جو اُنہی کی طرح بک جانے والا ہو، یا طاقت سے دب کر احکام دین میں تحریف کرنے لگے۔

اِس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستے سے الگ ہو چکا تھا۔* علمائے اُمّت نے تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم دینیہ کی

---

* اس مقام پر تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ بات سمجھ لینا مفید ہوگا کہ تیسری صدی ہجری میں جب عباسی خلافت پر زوال آنا شروع ہوا تو دینی قیادت تو بدستور علماء و فقہاء اور اخیارِ اُمّت کے ہاتھ میں رہی، مگر سیاسی قیادت

تدوین، اور درس و افتاء کا جتنا کام کیا، حکومت سے آزاد رہ کر، اس کی مدد کے بغیر، بلکہ بارہا اس کی مزاحمت کے باوجود اور اس کی بے جا مداخلتوں کا سخت مقابلہ کرتے ہوئے کیا۔ صلحاء امت نے مسلمانوں کے ذہن اور ان کے اخلاق و کردار کی تربیت و تہذیب کے لیے جو کام کیا وہ بھی سیاسی قیادت سے پوری طرح غیر متاثر رہا۔ اور اسلام کی اشاعت بھی زیادہ تر انہی بزرگوں کی بدولت ہوئی۔ سلاطین نے زیادہ تر صرف یہ خدمت انجام دی کہ ممالک فتح کر کے کروڑوں انسانوں کو اسلام کے دائرۂ اثر میں لے آتے۔ اس کے بعد ان کروڑوں انسانوں کا دائرۂ ایمان میں داخل ہو جانا بادشاہوں کی سیاست کا نہیں بلکہ صالحینِ امت کے پاکیزہ کردار کا کرشمہ تھا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہو کر دینی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ نہایت قابلِ قدر ہیں۔ آج یہ انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اسلام زندہ ہے اور امتِ مسلمہ اپنے دین کو اس کے صحیح خدوخال میں دیکھ رہی ہے۔ مگر اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافتِ راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی، جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے، بلکہ اس اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔ یہ صورتِ حال اگر ڈیڑھ دو صدی بھی باقی رہ گئی ہوتی تو شاید دنیا میں کفر باقی نہ رہتا، یا اگر رہ بھی جاتا تو کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ ہوتا۔

۳۔ دو حصوں میں بٹتی چلی گئی، یہاں تک کہ آخر کار عملاً اس قیادت کے مالک وہ امراء اور سلاطین بن گئے جن کے ہاتھ میں بالفعل حکومت کی باگیں آگئی تھیں، اور عباسی خلفاء صرف سیاسی سجادہ نشین بن کر رہ گئے جنہیں نہ دینی قیادت حاصل تھی، نہ سیاسی قیادت۔ صرف ایک نمائشی مذہبی تقدس تھا جو "خلافت" کے نام کی وجہ سے ان کو حاصل تھا۔ اسی کی بنا پر وہ سلاطین کی دستار بندی کرتے تھے اور سلاطین ان کا خطبہ و سکہ چلاتے تھے۔